اداس نسلیں: نوآبادیاتی تناظر میں

ڈاکٹر نجیب جمال* رخسانہ بی بی (رخسانہ بلوچ)**

Abstract

When a nation dominate the other, major changes and upsets occurs in culture, society, values and behaviours of the dominated nation. The commonalty feel no hesitation to adopt these changes and make themselves proud but the intellectuals and will wishers of the nation dominated remain uneasy and restless for the loss occur to their nation. In result of such circumstances two different classes of people come into existence in one country, which causes an unending uncertainty, hate, revenge and extremism. India, especially the Muslim community of India in the colonial ages faced such circumstances. Abdullah Hussain is a well-known novelist of Urdu and his novel "ODAS NASLAIN" is a master piece on of Urdu literature which proved him an intellectual and his novel is a reflection of his feelings about colonialism and its long lasting impacts on Indian society. This paper is a brief account of what the writer want to provide his readers with in view of colonialism.

نوآبادیات کی اصطلاح کے مفاہیم اردو میں اتنے زیادہ نہیں ملتے جتنی صراحت کے ساتھ انگریزی میں بیان ہوئے ہیں۔ اردو ادبی اردو لغت میں نوآباد اور نوآبادی کے مفاہیم اس طرح ملتے ہیں۔

نوآباد: (ف۔ ص) نیا آباد کیا ہوا۔

نوآبادی: (ا، مث) وہ بستی جو نئی بسی ہو، محکوم ملک۔ (۱)

---

* ڈاکٹر نجیب جمال

** رخسانہ بی بی (رخسانہ بلوچ)

فیروز سنز انسائیکلوپیڈیا میں زیادہ تفصیل ملتی ہے۔

نوآبادی (colony) غیر ملکیوں کی کسی بیرونی اور نسبتاً غیر آباد ملک میں آبادکاری جہاں وہ اپنے خورونوش اور رہائش کا معقول بندوبست کرلیں اور اپنے اصلی ملک سے تعلقات منقطع نہ کریں۔ تاریخ میں سب سے پہلے فونیشیا اور یونان کے باشندوں نے بحیرۂ روم کے ارد گرد اپنی نوآبادیات قائم کیں ۔ موجودہ اقوام نے سترھویں صدی میں نوآبادیات کا سلسلہ شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں انگلستان، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، ہسپانیہ، اور پرتگال کی نوآبادیات کا ایک جال دنیا کے مختلف مقامات پر بچھ گیا۔(۲)

انگریزی لغات میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نوآبادیات کا عمل صدیوں کی تاریخ پر محیط ہے۔ انگریزی میں نوآبادیات Colonialism کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کی وضاحت انگریزی کی مشہور لغت Longman میں ان لفظوں میں کی گئی ہے:

i. Control by one power over a dependent area of people.

ii. A policy advocating or based on such control.(۳)

اس تعریف کے مطابق محض کسی محکوم قوم یا رقبے پر اقتدار کو نوآبادیات کہتے ہیں جو عام حکومتی عمل سے کسی طرح بھی منفرد نہ ہے۔ لیکن اس تعریف میں استعماری طرز حکومت یا قبضے کو دیگر قبضوں سے الگ پہچاننا بھی ناممکن ہے۔ معروف انگریزی لغت "Oxford English Dictionary" نے Colonialism کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

> "A settlement in a new covntry, a body of people who settle in a new locality, forming a community subject to or connected with their parent state; the community so formed, consisting of their original settlers and their descendants and successors, as long as the connection with the parent state is kept up."(۴)

یہ تعریف تو طویل بھی ہے لیکن دلچسپ بھی ہے اس میں مرکزی ریاست کی بنیادی حیثیت پہ زور دیا گیا ہے۔ اس تعریف کے مطابق مختلف آبادکار جب کسی نئی زمین کو آباد کریں لیکن اُن کا تعلق آبائی ریاست سے برقرار رہے تو یہ نوآبادیات ہے۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ تعریف میں نوآبادیات گان (Colonized) کا ذکر گول کر دیا گیا ہے اور تعریف Parent State کے نوآبادکاریوں کو ہی مرکز بنا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تعریف

محض یورپی آبادکاری کے عمل کو ہی سامنے لاتی ہے۔ یہ عمل کیسے ممکن ہوااور اتنا عرصہ کیسے برقرار رہااس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ایک ادب کی ماہر "Gina Wisker" نوآبادیات کے بارے میں کچھ یوں رائے دیتی ہے:

> "Colonialism means the settlement of people and so the colonization of lands by powers from other, vsually economically richer, more powerful lands."(۵)

اب تک جتنی بھی تعاریف بیان کی گئیں ہیں وہ زیادہ تر یورپی آبادکاری کو نوآبادکاری قرار دیتی ہے۔اس عمل کو اگر دیکھا جائے تو اس میں عمل پیرا مغربی یورپ کے بیشتر ملک شریک تھے۔ خصوصاً وہ ممالک جن کے پاس بحری طاقت بہت زیادہ تھی جن کا اولین مقاصد سمندری راستوں کی تلاش اور تجارت کے واسطے نئی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے گئے اور قبضہ گروپ میں بدلتے گئے۔ یہ قبضہ کسی ایک خطے میں نہیں کیا گیااور نہ ہی اِن لوگوں کا ٹاکرا کسی ایک قوم یا قبیلے سے ہوا۔اُنہوں نے ہر طرح کے لوگوں کو قابو کرنے کے لئے اپنی حکمت علمی کو تبدیل کرتے رہے۔ یہی حکمت عملیاں اور حربے اصل میں اُس غیر فطری قبضے کو پانچ صدیوں تک برقرار رکھا۔

یورپین ممالک جغرافیائی لحاظ سے بہت مضبوط تھے۔اور سیاسی اعتبار سے بھی سمندری راستوں کا فائدہ اٹھانے لگے۔یورپیوں نے افریقی ساحلوں اور بندگاہوں پہ قبضہ کرتے ہی نوآبادیات کا آغاز کر دیا۔ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ اور مشرقی ایشیاء کی طرف پیش قدمی بحری راستوں کے ذریعے ہوئی۔ ڈچ اور انگریز پر تگال نے سولہویں صدی میں مشرقی اجارہ داری کو چیلنج کر دیااور پھر ڈچ نے پرتگیزیوں کو بھگا کر 1800ء میں جاوااور سائیلون کا کنٹرول سنبھال لیا۔ وہاں کے جزیرے کے حکمران کو تابع کر لیااور وہاں پر ہر کسی کے لنگر انداز ہونے پہ پابندی لگادی۔(۶)

نوآبادیات کا مطالعہ اصل میں ان حربوں اور حکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے اسی فیصد رقبے پہ قبضہ ہوااور اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان ملکوں کی ثقافت، معاشی ڈھانچے، سیاسی طریقہ کار اور زبان وادب آزاد ہونے کے باوجود نہ تو اپنی شناخت قائم کر پائے ہیں اور نہ ان اثرات سے نکل پائے ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو ہندوستان میں مضبوط کیااور 1857ء میں مرکزی سرزمین پہ فتح کا جھنڈا گاڑا۔انہوں نے نوآبادیاتی کالونیاں بنائیں اور آبائی وطن کے لئے وسیع پیمانے پر اجارہ دارانہ کاروبار کیا۔ ویسے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورے تو سترھویں صدی سے ہی شروع ہو گئے تھے اور اس تجارتی کمپنی نے حکومتی حیثیت تک کا سفر اٹھارویں صدی کے نصف تک مکمل کیا۔اس عمل کا باقاعدہ آغاز جنگ پلاسی سے ہوا۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ حکمت

عملی اپنائی کہ جو علاقہ بھی فتح کرنا ہوتا سب سے پہلے وہاں کے منتخب افراد سے تعلقات قائم کئے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ افراد اُس علاقے میں لوگوں کے اندر اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ان افراد کے تعاون سے مقامی آبادی میں موجود حکمران کے خلاف فضا قائم کی جاتی تھی اور مقامی آبادی کی رائے کمپنی کے حق میں لی جاتی تھی۔**(۷)**

شروع میں انگریز جب تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو یہاں کے جواہرات، لباس، پان دان، مرغن غذاؤں، دستر اخوان، پالکیوں اور ہاتھیوں کے استعمال والے کلچر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔اہلِ مغرب ہندوستان کے جادو میں پھنس گئے۔ وہ ہندوستان کی دولت، تہذیب اور خوش حالی سے شدید متاثر ہوئے۔اُنہوں نے آہستہ آہستہ اس کلچر کو اپنانا شروع کر دیا اور ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کرنا شروع کر دیں۔ مقامی زبان سے اتنے متاثر ہوئے کہ شاعری بھی کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی انگریز اقتدار کی خاطر یہاں آیا تو ہندوستانی تہذیب، کلچر اور لوگ گھٹیا، کم تر اور، سماندہ نظر آنے لگے تب اس کمپنی نے اپنے لوگوں کو غیر عیسائی اور ہندوستانی کلچر ترک کرنے حکم دیا۔ان کے نزدیک:

> "اگر لوگ ہندوستانی کلچر میں ضم ہوگئے تو ان کا تعلق بھی انگلستان سے ختم ہو جائے گا اور شاید ان کا وہی انجام ہو جو کہ ہندوستان میں مغلوں کا ہوا کہ وہ ہندوستانی ہو کر وسط ایشیاء سے اپنی جڑیں کھو بیٹھے اسی وجہ سے یہ کمپنی کے مفاد میں تھا کہ فرق نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں شہرت بھی آئے۔"**(۸)**

اگر نوآبادیاتی عمل کو گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مقامی افراد کی شناخت کو گُم کیا اور مقامی ثقافتوں کے بارے مصنوعی تصورات پھیلائے۔ (Oriental Knowledge)بنیادی طور پر ایسا حربہ تھا جس نے نوآبادیات کو ممکن بنانے میں اچھا کردار ادا کیا۔ مشرق اور ہندوستان کے ماضی کو اس علم کے ذریعے بگاڑ کے پیش کیا گیا۔ مثلاً اودھ اور صوبجات شمالی و مغربی کے بارے ولیم کروک (William Crook) کی رائے یہ تھی:

> "Even in the best days of the muglal rule no effective measures had been Taken to develop its resovrces, to secure internal peace, to protect the people from outrageous oppression."**(۹)**

حقیقت تو یہ تھی کہ اس وقت سیاسی اور معاشی تعاون بگڑ چکا تھا اور انگریز مکمل طور پہ قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی سیاست اور معشت تباہ ہو گئی تھی۔ جب یہ کمپنی سیاسی و معاشی طور پہ مضبوط ہوئی تو اس کے عزائم میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کمپنی کے ملازمین نے عام لوگوں سے دوری اختیار کی اور خود کو اعلیٰ مذہب یافتہ سمجھنا شروع کر

دیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کرنے شروع کر دیئے اور پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور سب کو دوسرے درجے کے شہری ہونے کا احساس بھی دلانا شروع کر دیا۔ اب ایسی حکومت جہاں قانون ہی نہ ہو، اس مین امن و امان کا رہنا اور ایمانداری کا نام و نشان ہونا ممکن ہی نہ تھا لیکن پھر بھی اس کا قائم رہنا معجزہ ہی تھا۔ سلطنت برطانیہ کے عہدیداروں نے مغلوں کی طرز پر دربار لگانے شروع کر دیئے، اُنہیں نے بھی جاگیریں تقسیم کیں اور اپنی مرضی کے لوگوں کو صاحب بہادر کا خطاب دیا۔ انیسویں صدی میں ایک مثالی ریاست کے تصور نے سب کچھ بدل ڈالا۔ لاتعداد کارلوریشنیں بنائیں گئیں۔ صحت و تعلیم اور دیگر ادارے بنائے گئے ساتھ ہی سڑکوں اور نہروں کے بنانے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ عوامی سہولتیں مہیا کی گئیں اور عوتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی دیا گیا۔ اپنی اصلاحات نے انگریزوں کی حکومت کو سنہری دور بنا دیا۔ جو کہ اصل میں سرمایادرانہ ترقی کے زیر اثر آبادی ڈھانچے کو مضبوط بنا کر اپنے معاشی مفادات کو بہتر اور تیز کران چاہتے تھے۔

ہندوستان میں برطانوی عہدے کو تین مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی جو کہ تجارتی سرمایہ داری کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہوئے اور وسعت اختیار کرنے گئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں پہ دھاندلی، جبر اور دھوکے سے اپنی اجارہ داری قائم کی۔ پر برطانیہ کی حکومت آئی تو انہوں نے کمپنی کا تجارتی ارہ داری ختم کر دی۔ دوسرے مرحلے میں صنعتی اجارہ داری کا آغاز ہوا اور برطانوی پارلمینٹ میں آزاد تجارت کے حق میں آوازیں اُٹھنے لگیں کیوں کہ :

> "آزاد تجارت کے لئے کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ضروری تھا۔ ساتھ یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ہندوستان سوتی کپڑا برآمد کرنے والا ملک نہ رہے بلکہ انگلستان میں قائم ہونے والے کارخانوں سے تیار شدہ کپڑا درآمد کرے۔" **(۱۰)**

سلطنت برطانیہ کا ایسٹ انڈیا کمپنی کو کمزور کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان سے آنے والے سرمایہ دار طبقے کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنے کے دروازے کھولنا تھا۔ اس طرح برطانوی سرمایہ داروں نے ہندوستان پر اپنی اجارہ داری مسلط کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ پورا کر لیا، اس کے بعد تیسرے آخری مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ برطانوی بادشاہت نے لے لی۔

اُنیسویں صدی کے اواخر میں برِصغیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زِندگی میں رُونما ہونے والا تبدیلی کا عمل بیسویں صدی کے آغاز میں بھی جاری رہا۔ تہذیبی تبدیلیوں اور سیاسی اُتھل پُتھل نے رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کی صُورت

اختیار کر لی۔ نظامِ حکومت میں اِنقلابی تبدیلیاں آگئی تھیں اور برطانوی سامراج نے حکومت سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظامِ تعلیم اور تہذیب کو مُتعارف کرانے بلکہ مُسلّط کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ لوگوں کے طرزِ زندگی میں بڑے پیمانے پر تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی طرزِ مُعاشرت کو قبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ سماج میں آنے والی تبدیلیاں ہمہ جہت تھیں اور سیاسی، معاشی اور مُعاشرتی سطح پر تبدیلی کے علاوہ اذہان اور افکار بھی نئی روشنی سے مُنوّر ہونے لگے۔ تبدیلی کی یہ لہر اِبتداً سُست رفتار تھی اور مُعاشرے کی طرف سے اِسے قبول کرنے میں ایک نوع کی ہچکچاہٹ بھی حائل تھی، لیکن وقت گزرنے پر اِس عمل میں نہ صرف تیزی آئی بلکہ اِس کا دائرہ بھی وسیع ہونے لگا۔

عالمی سطح پر بیسویں صدی کے اِبتدائی عشرے ہنگامہ خیز واقعات اور تبدیلیوں سے عبارت تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہوا، ۱۹۱۷ء میں اِنقلابِ رُوس وقوع پذیر ہوا، نتیجتاً مختلف عالمی طاقتوں کے مابین سیاسی، تہذیبی اور معاشی سطوح پر توازن بدلنے لگا۔

> "بیسویں صدی اپنے ساتھ جتنے ہنگامے لے کر آئی، واقعات اور تحریکات میں جتنی برق رفتاری اس صدی کے شروع میں ہوئی اس کی مثال تاریخ کے اور کسی دور میں شاید مشکل سے ملے گی۔"(۱۱)

بڑے پیمانے پر رُونما ہونے والی اِن تبدیلیوں نے اِجتماعی اور اِنفرادی ہر سطح پر زندگیوں میں ہلچل پیدا کی۔ ایک طرف مُعاشرہ نئے مسائل اور چیلنجز سے دوچار ہوا اور دُوسری جانب فرد ظاہری اور باطنی ہر دو سطوح پر کش مکش کا شکار ہوا۔ سماجی و سیاسی تبدیلیوں نے اِنتشار اور بے چینی کو جنم دیا اور اِس صورتِ حال سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے مُختلف شعبہ ہائے زندگی کی جانب سے مختلف طرح کا ردِ عمل ظاہر ہوا۔

ہندوستان سیاسی و اِنتظامی طور پر تہہ در تہہ غُلامی کی زنجیروں میں اِس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اگر غُلامی کی ایک صُورت سے نجات پا بھی لیتا تو دُوسری کو مُقابل پاتا۔ برطانوی سامراج ہی نہیں مقامی سطح پر نوابوں، راجاؤں، مہاراجاؤں کی غُلامی بھی ہندوستان کو گھیرے ہوئے تھی۔ یہی نہیں جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور زمین داروں نے بھی اپنے اپنے درجے پر حکمرانی سنبھالی ہوئی تھی۔ ایک طرف یہ سب مجموعی طور پر برطانوی سامراج کے تسلّط کی تقویت کا باعث تھے اور دُوسری طرف اپنے ہی ملک اور لوگوں کے مصائب و تکالیف میں اِضافے کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ایک طرف جاگیرداری نظام کا تسلّط قائم تھا، دُوسری طرف بیسویں صدی کے آغاز میں نیا نیا اُبھرتا ہوا سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام بھی ایک نئی طرح کی غُلامی کو فروغ دے رہا تھا۔

"پہلی جنگ عظیم نے ہندوستانی زندگی کے خالص معاشرتی ڈھانچے کو بدل کر اسے معاشی بنیادوں پر کھڑا کرنا شروع کر دیا اور شہروں میں کارخانوں کی ابتدا اور رفتہ رفتہ ان کے اضافہ اور کثرت نے سرمایہ دار اور مزدور کے مسئلہ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا پھر شہروں کی زندگی کے اس صنعتی انداز نے دیہاتی زندگی کے معاشی نظام میں خاصی الٹ پلٹ کی اور شہر اور دیہات یکساں طور پر اس صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے معاشی جال میں جکڑے گئے۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کش مکش شروع ہوئی۔"(۱۲)

جنگِ عظیم اوّل نے دُنیا بھر کے سیاسی واِقتصادی نظام کو بڑے پیمانے پر مُتاثر کیا۔ ہندوستان جنگ میں براہِ راست ملوّث نہ ہونے کے باوجود برطانوی نوآبادی ہونے کے باعث اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ پایا۔ سامراجی طاقت نے اپنے زیرِتسلّط ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے بعد صنعتی نظام مُتعارف کروایا اور یوں سرمایہ داری نظام نے اِس علاقے میں قدم رکھا۔

"یہ غیر ملکی حکمرانوں کی حکمتِ عملی تھی کہ ملک میں بیک وقت جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام کی بُنیادوں کو اِس طرح سے مضبوط کیا گیا کہ اِس کا اقتصادی، سماجی اور اخلاقی ڈھانچا تباہ ہو کر رہ گیا۔"(۱۳)

اِس تباہ حال مُعاشرتی وسیاسی ڈھانچے کو از سرِ نو تعمیر اور تنظیم وترتیب کی ضُرورت تھی۔ ماضی کے برعکس نئی سماجی و مذہبی اِصلاحی تحریکیں شروع کرنے کے بجائے سیاسی بیداری اور مُعاشرے کی تنظیمِ نو کے لیے پہلے سے موجود تحریکوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ مُعاشرے کے دِیگر طبقوں کے ہمراہ ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی ذِمے داری محسوس کرتے ہوئے قلم سے تبدیلی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔

اداس نسلیں میں اس دور کی عکاسی کی گئی ہے، اس ناول میں وہ تمام عناصر ملتے ہیں، جو نوآبادیاتی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں ۔پورا ناول ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتا ہے ، جو نوآبادیات کی سچی تصویر کشی کرتا ہے ۔ انگریزوں نے جو ریل کی پٹری بچھائی، یہ نوآبادیاتی اثر ہمیں ان دور دراز علاقوں میں بھی نظر آتا ہے جہاں آمدورفت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔

"روشن پور جانے کے لیے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔'(۱۴)

روشن پور کی آبادکاری بھی نوآبادیات کا نتیجہ تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں انگریز افسروں کی جان بچانے پر مختلف

لوگوں کو نوازا گیا تو ایسے میں کئی روشن پور وجود میں آئے۔اس وقت مسلم خواتین کا انگریزوں کے ساتھ جو عمومی رویہ تھا وہ بھی روش علی کی ماں کے کردار میں سامنے آتا ہے، جب روشن علی ایک انگریز کو زخمی حالت میں اٹھا کر گھر لاتا ہے تو اس کی ماں کی فوری رد عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ فرنگی کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں:

> "گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ان کے سامنے سنہری بالوں والا ایک انگریز پڑا تھا، جو ہندوستانی دکانداروں کے لباس میں تھا۔اس کا چہرہ بے حد زرد اور سانس مدھم تھا۔انھوں نے دوڑ کے دروازہ بند کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردے میں کر کے اس کا لباس تبدیل کیا اور ٹانگ کے زخم پر، جو تیز دھار آلے سے لگایا گیا تھا، پٹی باندھی۔پھر اپنی ماں کو بلایا۔پہلے تو اس نیک بی بی نے مریض کے فرنگی ہونے کی رُو سے اس کے نزدیک آنے سے انکار کر دیا۔مگر پھر روشن علی خاں کے ،اور اس کی بیوی کے، جو اس خوبصورت جوان کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر کافی غمزدہ تھی، منت سماجت کرنے سے اس کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہو گئی۔اس نیک بی بی کا مرحوم شوہر، یعنی روشن علی خان کا والد چھوٹا موٹا حکیم تھا اور گو اس کی وفات سے خاندان میں یہ پیشہ ختم ہو چکا تھا پر اس واسطے سے مرحوم کی بی بی کو ،جو مرحوم سے زیادہ طویل العمر ثابت ہوئیں، کسی حد تک حکمت میں دخل تھا۔بہر حال اس سفید فام مریض کے سلسلے میں ان لوگوں سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے کیا۔"**(۱۵)**

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء تک متوسط طبقہ بہت کم وجود میں آیا تھا۔مغلوں کے جاگیر داری نظام نے ملک میں دو طبقات کو جنم دیا تھا۔اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی اشرافیہ جس میں نواب، جاگیر دار، زمیندار، تعلقدار اور سردار وغیرہ شامل تھے اور نچلا طبقہ جس میں امراء اور رؤسا سے متعلق متوسلین و ملازمین اور گاؤں کے چھوٹے کسان یا زرعی مزدور آتے تھے۔۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی نظام و قوانین کے زیرِ اثر ملک میں ایک ترقی پذیر مڈل کلاس وجود میں نے لگی جس نے ایک طرف سرمایہ کاری اور تجارت کو فروغ دیا اور دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی حاصل کر کے افسر شاہی اور سروس سیکٹر کی قوت میں اضافہ کیا۔انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں اپنے مددگاروں کو جاگیریں عطا کیں، جن کی بنا پر زمین داری کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے شہروں میں بھی اپنے مستقر بنائے۔ایسا ہی ایک ٹھکانہ روشن محل ہے، جو روشن پور کی جاگیر کے نتیجے میں بنا ہے، روشن پور کی جاگیر اسی انگریزی عطا کا نمونہ ہے۔

ناول کے دوسرے حصے کا آغاز روشن محل کی اس تقریب سے ہوتا ہے جہاں روشن آغا کا بیٹا اب اس کی جگہ

روشن آغاز بننے جارہا ہے۔ یہ محل دہلی میں ہے۔ اس لیے اس دور کے دہلی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

دہلی کئی بار اجڑا اور کئی بار بسایا گیا۔ یہ مغلیہ شان و شوکت اور سطوت پارینہ کا نشان تھا۔ انگریز اگرچہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنا اقتدار مستحکم کرتے چلے گئے لیکن ۱۸۵۷ء تک انھوں نے دہلی کا منظر نامہ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کلکتہ کو حکومت اور بمبئی کو تجارت کا مرکز بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے کلکتہ اور بمبئی پر یورپی سوچ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جبکہ دہلی ۱۸۵۷ء تک مغلیہ اور روایتی طرز احساس کا اسیر محسوس ہوتا ہے۔ دہلی کی تاریخ میں انیسویں صدی کی بہت اہمیت ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا دہلی، ۱۸۵۷ء کے بعد کے دہلی سے یکسر مختلف ہے۔ نہ صرف باطن بلکہ ظاہر میں بھی۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں سے دہلی کو واپس لے لیا لیکن یہاں اپنا اقتدار جمانے کی بجائے اسے مغل شہزادوں کے حوالے کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت تک دہلی، مغلیہ خاندان کے لیے پایہ تخت رہا اور کلکتہ اور بمبئی کے برعکس دہلی، شہر سے زیادہ "A Collection of many villages"(۱۶) محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۴۴ء تک یہ شہر اتنا بدل گیا کہ ایک یورپی فوجی نے جو کلکتہ سے دہلی آیا تھا اس شہر کے لیے) "The Largest city of india" ۱۷(کا جملہ استعمال کیا گیا۔ ۱۸۳۳ء کی مردم شماری کے مطابق، محل کے علاوہ دہلی کی آبادی ۱۱۹،۸۶۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ۱۸۳۳ء، ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۵ء کی مردم شماری کے مطابق دہلی کی آبادی ۱۳۷۰۰۰، ۱۳۱،۰۰۰ تک رہی جبکہ ۱۸۵۴ء میں یہ آبادی ۱۵۱۰۰۰ افراد تک پہنچ گئی۔

> "An indian chronicler, writing in the early nineteenth century, who remarked on the extent of Calcutta, the buldings of Jaipur, the abundance of goods in lakhnow, though that Dehli was chiefly remarkable for aadmiyat, its polished urbanity. And the culture of Dehli was contained within its walls. The culture ..... was .... narrow - midedly urban, seaking protection within the city walls against a surrounding barbarism."**(۱۸)**

یہ شہر پھول والوں کی سیر، بسنت اور مشاعروں کا شہر تھا۔ ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور روایتی طرز احساس میں رچا بسا تھا۔ اگرچہ جدید روشنی کی کرنیں یہاں تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ دہلی میں چھاپہ خانوں کا قیام اس کی ایک مثال ہے۔ دہلی کی نشاۃ الثانیہ میں جن اداروں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان میں دہلی کالج سرفہرست ہے۔ اس کالج نے کئی نامور ہستیوں کو اپنے دامن میں سمویا اور دہلی کے باشندوں کی ذہنی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بھر

پور کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دہلی پر حکمرانی کرنے کا برطانوی خواب پورا ہوا اور اسی کے ساتھ عظیم مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزوں نے دہلی پر بھی قبضہ جمالیا اور یہاں سے دہلی کا ایک نیا روپ ابھرنا شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے چند برس اہل دہلی پر بہت بھاری گزرے۔ خصوصاً مسلمان نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ ان کی حب الوطنی شدید شبہات کی زد میں آگئی اور اگرچہ جنگِ آزادی میں ہندو بھی شامل تھے مگر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ صرف مسلمان بنے۔ شہری اپنی ہی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گیا۔ دہلی کے باشندے اپنے آبائی مسکن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور تباہی و ویرانی ایک دفعہ پھر دہلی شہر کو مقدر ٹھہری۔ لیکن جس طرح ہر ''کمال را زوال'' کا مقولہ درست ہے اسی طرح ہر زوال کے بعد عروج کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ دہلی شہر ایک دفعہ پھر آباد ہوا اگرچہ انگریزوں نے شہر کے پرانے طرزِ تعمیر اور طرزِ انتظام کو زیادہ تبدیل نہیں کیا پھر بھی اس دفعہ یہ شہر ایک نیا شہر تھا۔ جس میں پرانی ثقافت اور روایات کی بو باس کے ساتھ ساتھ چپے چپے پر نئی تعمیر اور ترقی کے اثرات موجود تھے۔ ۱۸۹۰ء میں شہر کو تجارتی مرکز (Commercial Capital) کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۷۷ء کے قحط کے باوجود دہلی شہر خوشحالی کی طرف گامزن رہا۔ تجارت، یہاں کے باشندوں کا مطمع نظر ٹھہری۔ شہریوں کا طرز حیات جدید تر ہوا۔ نکاسی آب اور بہم رسانی آب دونوں کے طریقے تبدیل ہوئے۔ پرانے کنوؤں کی جگہ مرکزی نہر نے لی اور پھر نہر سے بھی آگے گھر گھر پانی کی لائن بچھنی شروع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء تک دہلی کی حکومت، اپنے شہر کی ترقی و خوشحالی پر لاہور اور امرتسر سے زیادہ خرچ کر رہی تھی۔ یہ تو دہلی کا بیرونی منظر نامہ تھا۔ شہر کے لوگ، نئی روشنی سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ نچلے طبقے کے لوگ بھی نہ صرف اپنے حقوق سے آگاہ تھے بلکہ ان کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس حوالے سے ناریانی گپتا (Naryani Gupta) لکھتے ہیں:

> "The "mohulla" sweepers went on strike again in 1889....What gave the sweepers confidence this time was the fact that there were no bye-law under which they could be punished, and as education (was) becoming more general and lawyers were plentiful, they were aware of this."(۱۹)

صحت و صفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ویکسینیشن لازمی تھی۔ اگرچہ دہلی کے باشندے اس کو پوری طرح قبول کرنے میں شدید ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتے تھے لیکن تبدیلی کے آثار بھی نمایاں تھے۔ دہلی کے لیے

ایک اور اہم تبدیلی ریل کی آمد تھی۔ یوں تو انیسویں صدی کے نصف آخر (۱۸۶۰ء) ہی سے ریل اہلیان دہلی کے لیے عجوبہ نہیں رہی تھی لیکن بجلی کی آمد کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں شہر میں ٹرام کا نظام رائج ہوا جس نے شہر کو بالکل نئی شکل دی۔ اسی دوران میں دہلی کی آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ فصیل شہر کو اکثر و بیشتر گرادیا گیا اور اگر کہیں اسے باقی رہنے بھی دیا گیا تو اس کی حیثیت آثار قدیمہ سے زیادہ نہ رہی۔ اب دہلی شہر تعلیم، صحت، فنون لطیفہ اور تجارت سمیت ہر پہلو میں دوسرے شہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ ناول کے دوسرے حصے کا آغاز روشن محل کے محل وقوع سے ہوتا ہے۔ جس میں سڑکوں کے ناموں سے ہی نو آبادیات اپنے نام چھوڑتی نظر آتی ہے۔

> "کوئینز روڈ کے آخر میں روشن محل تھا۔ یہ ایک قدیم وضع کی وسیع، دومنزلہ کوٹھی تھی۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتا تھا۔" **(۲۰)**

روشن محل میں دستار بندی کی تقریب سے پہلے کئے جانے والے انتظامات میں مغربی رنگ کی آمیزش صاف نظر آتی ہے:

> "ان کو دور ہی سے آج کے دن کی چہل پہل دکھائی دے گئی۔ پھاٹک پر کاغذی جھنڈیاں اور رنگ برنگ بجلی کے قمقمے لٹک رہے تھے۔ بہلی سے اترے تو انھوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیو پر، جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی، تازہ سرخ بجری بچھائی گئی تھی اور دونوں اطراف چونے کی متوازی لکیریں لگی تھیں۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں۔ ایک پر میز پوش تہہ کیے رکھے تھے، دوسری کے گرد بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔ دن کی روشنی ابھی باقی تھی مگر برآمدے اور باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔ صرف برآمدے میں شور تھا جہاں میز کے گرد خوش پوش اور تندرست لڑکے لڑکیاں جمع کام کر رہے تھے۔ سبزے پر نوکر سفید وردیاں پہنے خاموشی سے ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔" **(۲۱)**

روشن محل میں نواب صاحب کے کمرے کی تزئین و آرائش میں بھی مغربی رنگ کی آمیزش ہے:

> " کمرہ بڑے قرینے سے سجا تھا۔ نعیم کے عین پیچھے ایک بھس بھرا شیر کھڑا تھا جو خطرناک حد تک زندہ دیکھائی دے رہا تھا۔ چاروں کونوں میں اونچے اونچے فرشی لیمپ روشن تھے۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے اور فرش پر دبیز بے آواز قالین پڑے تھے

۔برآمدے کے شور کے مقابلے میں اندر گہری خاموشی اور سکون تھا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ دروازوں کھڑکیوں کی درزیں فلالین کی تہوں سے بند کی گئی تھیں۔"(۲۲)

ریل اور دیگر مغربی اشیا کی طرح کیمرہ بھی اب متوسط درجے کے لوگوں کی زندگی کا حصہ بننے لگا:

"ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی گھسیٹی اور کیمرہ نکال کر رات کی تصویریں لینے کے لیے اسے تیار کرنے لگا۔"(۲۳)

متمول طبقے کی پارٹیوں میں انگریز بھی شرکت کرتے تھے۔ روشن محل کی تقریب میں آنے والے غیر ملکی مہمانوں کا تذکرہ یوں ہے:

"ابھی تک جو لوگ آچکے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھی۔ چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے۔ باقی نے، جو زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا۔ شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگے تھے۔ تقریباً سبھی خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے۔ عورتوں نے بند گلے کے چست فراک پہن رکھے تھے۔"(۲۴)

مقامی ہندوستانیوں کے طبقہ امراء کا احوال یوں ہے:

"اب ہندوستانی مہمان آرہے تھے۔ وہ مختلف قسم کے لباس میں تھے۔ مسلمان پھندنے والی سرخ ٹوپیوں اور لمبے لمبے چوغوں میں تھے۔ کچھ لوگ شیروانیوں میں بھی تھے جن سے ان کے قوم و مذہب کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلم عیسائی سب نے شیروانیاں پہننی شروع کر دی تھیں۔ البتہ ہندو اپنی ڈھیلی اڑنگ دھوتیوں اور بڑی بڑی سفید پگڑیوں سے پہچانے جا سکتے تھے۔"(۲۵)

ہندستانی امراء اور انگریزوں میں سواری کا فرق بھی عام تھا۔ ہندستانی نواب مہاراجے تو نوآبادیاتی رنگ میں رنگے جا چکے تھے، اور انگریز انھیں قبول بھی کرتے تھے، عام امراء کو ابھی تک شاید وہ درجہ نہیں ملا تھا، جس کی وجہ سے ان کے رکھ رکھاؤ اور ادب آداب میں ابھی انگریزوں والا قرینہ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی انگریز مقامی لوگوں سے ایک خاص قسم کا فاصلہ رکھتے تھے، جس میں اپنے تفاخر کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی شامل تھا:

"دو دو چار چار گھوڑوں والی بہلیوں میں آرہے تھے۔ صرف انگریز مہمان اور چند

ہندوستانی موٹروں پر آئے تھے۔ وہ پھاٹک پر نواب صاحب اور ان کی ساتھی عورت کے ساتھ اخلاق سے جھک کر ہاتھ ملاتے یا دور سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ انگریز سب سے ایک طرف بیٹھے تھے، ہندوستانی دوسری طرف۔ غیر ملکیوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اور سکارف آتے ہی خادموں کے حوالے کر دیے تھے۔ ہندوستانی ٹوپیاں پہنے، چھڑیاں ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔"(۲۶)

پرتاب گڑھ کے مہاراجہ کا انداز انگریزوں والا تھا، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی حاکم صرف اسے قبول کرتے تھے جو ان کی مجبوری ہوتا تھا:

"ایک ہندوستانی زرق برق شیروانی اور پگڑی پہنے موٹر سے اترا۔ ساتھ ایک نوجوان انگریزی لباس میں تھا۔ نواب صاحب بہت نیچے جھک کر ملے۔ کسی نے کہا مہاراج کمار پرتاب گڑھ ہیں؛ ہمراہ غالباً سیکرٹری تھے۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جو آکر انگریزوں میں بیٹھے۔ انھوں نے اپنی چھڑی بھی خادم کے حوالے کر دی۔"(۲۷)

چیف کمشنر گوکھلے کی آمد اور سراپا ملاحظہ ہو:

"پھر گوکھلے آئے جس پر تمام ہندوستانی اور چند انگریز اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر ملے۔ ایاز بیگ نے جب ان کا نام لیا تو نعیم چونک اٹھا اور قریب جا کر کھڑا ہوا۔ گوکھلے کا نام اس نے بہت سن رکھا تھا مگر دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ انھوں نے پتلون کے اوپر ہند گلے کا بڑے بڑے کالروں والا ھاف کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لیے ہوئے تھے (اس قسم کی ٹوپی نعیم نے کلکتے میں تلک کو بھی پہنے دیکھا تھا)، گلے میں لمبا سا مفلر بھی تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے اکہرے جسم کا یہ آدمی خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا، اگرچہ بہت کمزور تھا۔"(۲۸)

انگریز حاکموں سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کا کوئی موقع مقامی حاکم جانے نہیں دیتے۔ عام انگریز انتہائی ریلیکس انداز میں باتیں کر رہے ہیں، ھیٹ اگر گھاس پر پڑا ہے تو کوئی بات نہیں، لیکن ایسے میں مہاراجہ کا انداز ملاحظہ ہو جو انگریز حاکم کو یہ جتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں بھی آپ جیسا ہی ہوں اور ہندوستانیوں کو بھی اس بات کا احساس دلانا مقصود ہے کہ انگریزوں سے میرے بے تکلفی مجھے تم سب سے برتر بنا رہی ہے:

"مہمانوں کی ٹولیوں میں گفتگو بڑے زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تین انگریز

بیٹھے چوتھے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ یہ چوتھا، جس کا سیاہ ہیٹ نیچے گھاس پر پڑا تھا ،ادھیڑ عمر کا بڑے سے سر والا شخص تھا،اور بڑی محویت سے ڈرامائی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ نعیم آگے بڑھا۔ایک لمبے صوفے پر مہاراجکمار پرتاب گڑھ چیف کمشنر کے ساتھ بیٹھے تاش کے پتے بانٹ رہے تھے۔" تاش کے لیے یہ موزوں وقت تو نہیں مسٹر۔۔۔،پر میں آپ کو سکھانے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔ایسا عجیب وغریب کھیل ہے جو یہاں پر کسی کو نہ آتا ہوگا۔ گزشتہ ماہ میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔" انھوں نے پتوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر تاش اپنے سیکرٹری کو پکڑائے اور خود چیف کمشنر کو کھیل کے ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہرِ فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔"**(۲۹)**

عام آدمی کے ساتھ اس دور میں کیا سلوک ہوتا تھا،نوآبادیات کیسے طبقاتی فرق کی خلیج کو اور گہرا کر رہی تھی۔اس کا اندازہ روشن محل کے پارٹی کے دوران گیٹ پر کھڑے نچلے طبقے کے لوگ اور ان کے ساتھ محافظوں کے سلوک سے ہوتا ہے:

"پھاٹک کے اندر جو کاریں کھڑی تھیں ان کا نظارہ کرنے کے لیے چند بچے اور نچلے طبقے کے لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ چیف کمشنر کے ہمراہ آئے ہوئے سپاہی انھیں بید مار مار کر بھگا رہے تھے۔لیکن وہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جا کھڑے ہوتے۔"**(۳۰)**

مقامی امراء نہ صرف انگریزوں سے تعلق کو تفاخر کا ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ بدیسی چیزوں کے استعمال بھی ان کے احساس برتری کو ظاہر کرتا تھا،روشن محل کی تقریب کے ایک دو مناظر ملاحظہ ہوں:

"نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک رائفل اور ایک بڑی سی پستول، جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا ،لا کر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔۔۔۔افوہ یہ جرمن۔ کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھیے اس ساری پستول میں آپ کو ایک بھی کیل(rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔پار سال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا۔"**(۳۱)**

متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کا وسطی زمانہ تہذیبی اور سیاسی تبدیلیوں کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تبدیلیاں دور رس اور اثر انگیز تھیں۔۱۷۵۷ء میں پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ

کے نتیجے میں انگریز حکومت بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں میں باضابطہ طور پر حکمرانی کے اختیارات حاصل کی چکی تھی۔ اگرچہ جنوب میں انگریزوں کو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی صورت میں شدید مزاحمت کا سامنا تھا لیکن اس مزاحمت کے باوجود ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ حکومت کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انتظامی امور سنبھالنے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ قبل ازیں مغلیہ دور کی شہنشاہیت کے اثرات کے تحت ہندوستان کے طول و عرض میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ تقریباً تمام ریاستوں میں دفتری معاملات اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے فارسی زبان ہی استعمال ہوتی تھی۔ سرکاری اور دفتری زبان ہونے کی حیثیت سے اس دور میں فارسی زبان کی اہمیت مسلمہ تھی۔ چنانچہ حصول تعلیم کے لیے بنیادی میڈیم بھی فارسی زبان ہی قرار پائی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی شعر و ادب اس دور کی مجلسی زندگی کا اہم حصہ تھا چنانچہ ابتدا میں حکومتی معاملات چلانے کے لیے جو افرادی قوت دستیاب تھی وہ اسی فارسی دان طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس مجبوری کے پیش نظر انگریز حکمرانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود فارسی اور مقامی زبانوں میں مناسب استعداد پیدا کریں تاکہ دفتری معاملات کی دیکھ بھال کے لیے یہ زبان افسر اور ماتحت میں رابطے کا کام دے سکے۔ اس بنیادی ضرورت کے پیش نظر انگریز حکمران فارسی سیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔

عمومی تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں لسانی حکمتِ عملی کی چار سمتیں تھیں۔ پہلی سمت یہ ہے کہ اس جاگیر دارانہ نظام میں ایک کالونی کی حیثیت کی تھی؟۔ یعنی لسانی حکمتِ عملی کا تعین کالونی کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس دور کی لسانی حکمتِ عملی کی دوسری سمت یہ ہے کہ اس دور میں یہ تصور عام تھا کہ یورپ کا فرض ہے کہ وہ انگریزی کی تعلیم عام کر کے دنیا کو "مہذب" بنائے۔ اس تصور نے اس دور میں ایک بیانیے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔ تیسرا اہم عنصر جس نے اس دور کی لسانی حکمتِ علمی پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے، مقامی آبادی میں طبقات کا وہ نظام تھا جو صدیوں سے موجود تھا اور جس سے غیر ملکی حکمرانوں اور نوآبادکاروں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔ ان طبقات میں معاشی، معاشرتی، نسلی اور علاقائی اعتبار سے منقسم طبقات نظر آتے ہیں۔ اور چوتھی سمت وہ تھی جو تاریخی تصورات کے تحت استشراقی نقطہ نظر کے حامی مسلسل بیان کر رہے تھے جس میں اقوام کی روایات اور اقوام کے انحطاط پر زور دیا جاتا تھا۔ **(۳۲)**

اس تناظر میں "اداس نسلیں" کو دیکھا جائے تو مقامی لوگوں کو معلوم تھا کہ انگریزی ان پر مسلط کی جا رہی ہے، نعیم جو خود انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہے، اس ماحول کا حصہ ہونے کے باوجود اسے اپنی زبان اور اپنے ملک پر ہونے والی

ناانصافی کا شعور ہے ،اور یہ شعور اب اس عوامی شعور میں بدل رہا ہے جو بدیسی حاکموں سے رہائی چاہتا ہے۔ لیکن شاید انگریز حکمران اگر اس کی اہمیت جانتے بھی تھے تو ابھی عام لوگوں کو یہ باور نہیں کرانا چاہتے تھے، کہ ان کی گرفت کمزور بھی پڑ سکتی ہے۔ روشن محل کی تقریب میں بانکی پور میں کانگرس کے اجلاس کی بابت گفتگو ملاحظہ ہو:

> "آپ جنوبی افریقہ سے آرہے ہیں، میں جانتا ہوں۔ مگر وہاں کا مقابلہ آپ ہندوستان سے نہیں کر سکتے۔ یہاں تو سیاست ،یعنی پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے"۔ "پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد ؟"۔ "یہی کہ ،تعلیم یافتہ ہیں۔تاریخ سے واقف ہیں،اور۔۔۔" دفعتاً نعیم آگے بڑھا، جس سے اس کا چہرہ، جو سرخ ہو رہا تھا، روشنی میں آگیا۔ذرا سا جھک کر نوعمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا: "اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی"۔ سب نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا۔اس نے ٹوپی کے پھندنے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "یہ کوئی بری بات نہیں ،اس کے علاوہ کوئی بھی زبان سیکھنا معیوب نہیں، بلکہ اچھی تعلیم ہے"۔ اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کو بولا۔ "اس لیے کم پڑھے لوگ قید کر دیے جاتے ہیں۔ اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں۔ تلک جیل میں ہے کیا؟"۔ اخبار نویس انگریز کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ "**(۳۳)**

"اداس نسلیں" میں برطانوی سامراج کی سازشوں، تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل اور اس تحریک میں پنجاب کے دیہاتوں کے کسانوں نے حصہ لے کر جو قیمت ادا کی، وہ اس نوآبادیات کا ردعمل تھا، ناول میں اس کے اثرات کی نشاندہی وسیع پیمانے پر کی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم جو ایک کسان کا بیٹا ہے، جب عذرا سے منسلک ہو کر شہر میں بسے جاگیرداروں کے سماج میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کا رشتہ کسانوں کی روایات سے کٹنے لگتا ہے۔ کسان ذہن اور جاگیردارانہ اقدار کے درمیان کش مکش ہوتی رہتی ہے کیونکہ نعیم نہ مکمل طور پر گاؤں کی روایات کو ترک کر سکا اور نہ اعلیٰ طبقے کی روایات کو اپنا سکا۔ 'لندن کی ایک رات' کے کرداروں میں بھی یہی کش مکش ملتی ہے جہاں وہ نہ مشرقیت سے کنارہ کش ہو سکے اور نہ مغربیت میں پورے کے پورے ڈھل سکے۔ یہ کش مکش دراصل نوآبادیات کا شاخسانہ ہے۔

"اداس نسلیں" میں نہ صرف برصغیر کی تاریخ کے کئی ادوار کو تہہ بہ تہہ کھولا گیا ہے بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی شہر اور دیہات کے باسیوں کی سائیکی پر کس طرح اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ ناول کا مقام

عمل مشرقی پنجاب کا ایک گاؤں روشن پور ہے۔ جاگیر دارانہ جبر واستحصال کے سائے میں پلتے ہوئے کسانوں کو جبراً بھرتی کر کے جنگ عظیم میں لڑنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ روشن پور کا مہندر سنگھ اور نعیم اپنے ہی جیسے لاکھوں کسان نوجوانوں کی طرح زبردستی سپاہی بنائے گئے تھے۔ جو یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر جرمنوں اور فاشسٹوں سے لڑتے ہوئے مارے جاتے تھے یا اپاہج ہونے پر وطن واپس بھیج دیئے جاتے تھے۔ اس جنگ میں نعیم نے انسانی جان کی اتنی تباہی اور بے قدری دیکھی تھی کہ ایک تھکا دینے والی بے حسی اور جان لیوا بے خوفی اس کے ذہن پر دھند کی طرح چھا گئی تھی، اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے عزیز ساتھی ٹھاکر داس کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ محاذ سے واپسی پر جب اس کی ملاقات مہندر سنگھ سے ہوتی ہے تو نعیم اور مہندر کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے، وہ نوآبادیاتی استبداد کا عمدہ نمونہ ہے۔

> "تمھیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا' جرمنوں نے حملہ کیا ہے'۔ 'کہاں روشن پور پر؟'۔ 'یہاں'۔ 'اور ہم یہاں کیوں ہیں۔ کس لیے آئے ہیں؟' ۔ 'جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔ بس'۔ 'ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ بس میں اتنا جانتا ہوں، انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔ چناں چہ کل کتنے مالک ہیں ایک دفعہ بتاؤ'۔ وہ ایک دم چڑ کر بولا۔۔۔ مالکوں کی بحث بے کار ہے۔ ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنھوں نے مالکوں کو بنایا جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو ہمارے ملک کو غریب کر رہے ہیں ۔ تم ان سے لڑنے کے طور نہیں جانتے۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے اور ایسے کئی ہندوستانی انگریزوں کی ملکیت ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔" **(۳۴)**

نعیم نے مہندر سنگھ کے لڑنے سے انکار پر اس کو انگریز کمانڈر کے ہاتھوں شوٹ ہوتے دیکھا تھا، اس نے کسانوں کے جھونپڑے اور پکی فصلیں تباہ ہوتے دیکھی تھیں اور بڑے بڑے بانکے اور چھبیلے سورماؤں کو مٹی کی دیوار کی طرح گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے مورچوں میں کیچڑ میں لت پت سپاہیوں کو بموں سے مرتے دیکھا تھا، اس نے دشمن کہلائے جانے والے اپنے ہی جیسے انسانوں کو حیرت و حسرت سے سنگینوں کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ "اداس نسلیں" میں ہندوستان کے کسان کی روح کی اداسی، زندگی کی یکسانیت اور بے مصرف محنت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں، جاگیرداروں کے استحصال، مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ اور قدرتی آفات نے اس کسان کو اتنا بے حس و بے کس

بنادیا ہے کہ اس کی زندگی میں خوشی یا سکون، نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ وہ محنت کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے اور محنت کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ محنت نہ اس کے معیارِ زندگی کو بلند کرتی ہے اور نہ اس کے سماجی رتبے میں کوئی اضافہ کرتی ہے کیونکہ اس کی محنت کے پھل برطانوی جبز واستبداد کے زیر سایہ پلتی ہوئی روشن آغا جیسی جونکیں چوس لیتی ہیں۔

نعیم اور عذرا کے مرکزی کرداروں کے متوازی نعیم کے چھوٹے بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ کے کردار بھی ہیں۔ علی اور عائشہ گاؤں کی پر سکون فضا میں کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں اور باغوں کی گھنیری چھاؤں میں پل کر جوان ہوئے ہیں، چونکہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لیے ان کے مزاج میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت ہے۔ نعیم کی سخت گیری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے علی شہر بھاگ جاتا ہے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد مل مزدور بن جاتا ہے۔ عائشہ اور علی ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں عسرت اور بے چارگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں لیکن مل کا سخت ڈسپلن، کمر توڑ محنت اور قلیل اجرت علی کی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں اور عائشہ مستقل مریض بن جاتی ہے۔ شہری زندگی کی سرد مہری، سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے ذریعے گاؤں سے ہجرت کر کے شہر میں بسے مل مزدوروں کا استحصال اور تن دستی مل کر علی کو اپنی ذات اور معاشرے سے کاٹ دیتے ہیں۔ وہ شہر کی بے کیف اور خود غرض سوسائٹی میں کسی طور بس نہیں پاتا اور گاؤں کی کھلی فضا، کسانوں کے روایتی بھائی چارے اور مشترکہ زندگی کو یاد کر کے اداسی اور خود ترحمی کے احساس میں مبتلا رہتا ہے:

> "درختوں سے محروم بدرنگ فضا میں دھوپ چلچلاتی اور صاف ستھرے مکان اجاڑ معلوم ہوتے ہیں، جن کی اپنی چھتیں تھیں اپنے صحن تھے، اپنی اپنی زندگیاں تھیں، جب وہ راستہ میں ملتے تو کسانوں کے اکھڑ دوستانہ لہجے میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے پر دلوں کی ھمسائگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے خول نما گھروں میں واپس آجاتے۔ اپنی اپنی منفرد دنیا میں مستقل بدلتی ہوئی زندگی کے زیر اثر رہنے کے لیے۔۔۔ گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اور حدیں، جہاں ہر کسی کو اپنی اپنی جائداد پر فخر ہوتا تھا پر جولا محدود تھی۔ جس میں لاتعلقی نہ تھی۔ ساجھے کے صحن اور ساجھے کی دیواریں، منڈیریں، جن پر ہر کوئی بیٹھ سکتا تھا اور جن کی ہر کوئی مرمت کر سکتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے گھر جن کا پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے تھے اور کہاں پر ختم۔ مڑتی ہوئی بے ترتیب گلیاں کہیں سے چوڑی کہیں سے پتلی اور بیچ میں گندے پانی کی نالی، چلتے چلتے جس

میں پاؤں پھسل کر جا پڑے اور چھینٹے اڑ کر ٹانگوں کو خراب کر دیں! چلتے چلتے پھر ایک گلی اچانک ختم ہو جائے اور آگے راستہ بند اور وہاں ایک چھپر ہو اور ایک کنبہ۔۔ارے یہ گلی ہے یا گھر؟ 'السلام علیکم مائی۔اللہ کرم کرے' ۔دنوں کی ہمسائگی ختم ہو چکی تھی۔اب وقتِ مقررہ پر لوہے کے اوزاروں اور سیمنٹ مسالے اور تپے ہوئے سرخ لوہے کے ساتھ مل کر کام کرتے رہو۔ایک تال۔ایک تال۔"**(۳۵)**

نو آبادیات کے اثرات میں سے ایک سیاست بھی ہے، یہ سیاسی شعور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات، علم اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور دیگر کئی اسباب کی دین تھا۔'اداس نسلیں' میں بھی اس سیاسی شعور کو اس تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں سے اس دور کا ہندوستان گذر رہا تھا۔دیکھا جائے تو اداس نسلیں تقسیم ملک سے پہلے کی ربع صدی کے پنجاب کی دیہی زندگی کے حوالے سے تمام سیاسی اتھل پتھل اور عوامی بے چینی کا مرقع ہے۔اس میں اس دھرتی کی بو باس، ایک کسان کے ظاہر ہو باطن کی جیتی جاگتی تصویریں، اس کی محبت اور نفرت، جفاکشی اور ظلم سہنے کی قوت اور انگریزوں کے جبر واستحصال اس مکمل پیمانہ پر نظر آتے ہیں کہ یہ ناول ایک رزمیہ کی سی بلند آہنگی اور وسعت کا حامل بن جاتا ہے۔

"اداس نسلیں" کا کینوس نہایت وسیع ہے اس میں نہ صرف ہندوستان کے غریب و مفلس عوام کی زندگی کو تاریخ کے تناظر میں دکھایا گیا ہے بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی شہروں اور دیہاتوں پر ان کے مادی حالات کے مطابق اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک آزادی کے دوران سب سے زیادہ تباہی اور ہلاکت ان محنت کشوں کی ہوئی جو نہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن تھے اور نہ ہی سامراجی میکنزم (Mechanism) کی پیچیدگیوں کو سمجھتے تھے۔ایک طرف روشن آغا اور ان کے عزیز واقربا تھے جو ان بے شناخت کسان مزدوروں کی محنت کے بل پر شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس کے لیے انھیں سامراج کو جبریہ بھرتی کئے گئے سپاہی اور نذرانے دینے پڑتے تھے، دوسری طرف وہ مظلوم مزارعین اور مزدور تھے جن کی زندگی روشن پیلس اور اس کے مکینوں کو دنیا کی ہر بہترین چیز فراہم کرنے کے لیے وقف تھی۔

ناول کا مرکزی کردار نعیم زندگی کے ہر مرحلے سے گزرتا ہوا تمام تاریخ اور سیاست کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔وہ پہلے دہشت پسندوں کے گروہ میں شریک ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا مزاج اعتدال پسند ہے اس لیے وہ ان کے نظریاتی جنون سے اکتا کر ان کو زیادہ وسیع پیمانے پر جدوجہد کرنے کا مشورہ دیتا ہے:

"تم لڑائی کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی بڑا دماغ بھی چاہیے۔ چند لوگوں کی دہشت پسندی سے کیا ہوگا؟ اس جنگ میں ہم اتنے ہی شریک ہیں جتنے تم۔' اس نے رک کر پسینہ پونچھا جو اس سرد رات میں اس کے ماتھے پر نمودار ہو گیا تھا۔ 'ہماری تحریک عوام میں ہے، کسانوں اور مزدوروں میں لاکھوں اور کروڑوں میں ، جس کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت ہے۔ تم نے تاریخ اور معاشیات کا مطالعہ کیا ہے مگر عقلِ سلیم بھی ایک شے ہے۔ ایک ریل گاڑی اڑانے سے تم کیا کر لوگے؟ ہندوستان میں ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ آزادی کے لیے ریل گاڑیوں سے نہیں، ان میں سفر کرنے والے لاکھوں لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔" **(۳۶)**

لیکن تشدد پسند اس کی میانہ روسیاست کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے کیونکہ وہ زیادہ تر ان طبقات سے تعلق رکھتے ہیں جو زمین داروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے ہیں، جنھوں نے زندگی بھر پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھائی ہے، دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی خوشی نہیں دیکھی ہے، ہر مسرت ان سے چھین لی گئی ہے، ان کی عورتیں دوسروں کے استعمال میں رہی ہیں، ان کو بے زمین و بے گھر کر دیا گیا ہے جب کہ نعیم کے ساتھ اس طرح کے مظالم یا ستم کبھی نہیں ہوئے ہیں کیونکہ وہ ان دہشت پسندوں کے بہ نسبت سماجی رتبہ کے اعتبار سے ایک سیڑھی اوپر ہے، روشن آغا کا داماد بننے اور جنگِ عظیم میں وکٹوریا کراس جیتنے پر نعیم کے سماجی رتبے میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

دہشت پسندوں کے گروہ کو چھوڑ کر نعیم کانگریس کے پروگراموں میں حصہ لینے لگتا ہے۔ وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے کراتا ہے، جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی انکوائری کمیٹی میں حصہ لیتا ہے، کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے استقبالیہ جلوس میں مظاہرہ کراتا ہے اور گاؤں گاؤں انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنے اور عوام کو متحد کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اور جیل کاٹتا ہے۔ حکومت اس کا کراس ضبط کر لیتی ہے لیکن آزادی کی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے اور بالآخر ملک آزاد ہوتا ہے۔ نعیم جو اب بوڑھا ہو چکا تھا آزادی ملتے ہی اپنے جسم میں ایک نئی توانائی محسوس کرتا ہے:

"پارلیمنٹ کی عمارت کی بیرانی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے آزادی اور مسرت کا لمبا سانس لیا۔ پھر وہ مظاہرین کے ہجوم میں گھس گیا۔ اسے ہر طرف سے دھکے پڑ رہے تھے ۔ اور سیاہ غلیظ بدنوں سے پسینوں کی تیز بو آ رہی تھی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ ہجوم کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔ 'انقلاب زندہ باد' کئی ہزار لوگ چلائے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مختلف قسم کے نعروں کا شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا۔ 'انقلاب

زندہ باد۔ اکھنڈ بھارت زندہ باد۔ حکومتِ برطانیہ مردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ سول نافرمانی۔ آزادی۔ زندہ باد۔ "**(۳۷)**

آزادی کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے مناظر کے ساتھ ناول تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن تہذیبوں کے تقابلی مطالعے اور نو آبادیاتی اثرات کے متعلق بہت سا مواد محققین کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ اردو ادبی لغت، دہلی: نور محمد تاجران کتب لال کنواں دہلی، مطبوعہ، سن رائز پریس عید گاہ روڈ، دہلی، س۔ن، ص، ۸۸۲

۲۔ فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، تیسرا ایڈیشن، جنوری ۱۹۸۴ء، ۲۰۰۱

۳۔ (1984) Longman Dictionary of English language, P.288.

۴۔ Oxford English Dictionary, London. in Ania Loomba (1998) Colonia lism/Postcolonialism, London: Routledge. P.f. Key Concepts in postcolonial Literature. New Youk: Palgrave Macmillian,

۵۔ P.if.(2007)

۶۔ والیٹر، اوراق ہند، مترجم: جمیر اشفاق، ۲۰۱۱، لاہور سانجھ، ص ۶۱

۷۔ Sugata Bose & Aysha jalal (1998) Modern south Asia: History, Culture Political, Economy. Lahore: Sang-e-Meel Publications P.8.

۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور تحقیق، ۲۰۰۵ء لاہور، فکشن ہاؤس، ص ۶۳

۹۔ William Crook,(1897) the north westerm provinces of india; Their History, Ethrology, and Administration. London: Methuen & co, P.125.

۱۰۔ ملک عبداللہ، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۷ء، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۲۸۲

۱۱۔ وقار عظیم، سیّد، نیا افسانہ، دہلی: ساقی بک ڈپو، سنہ ندارد، ص ۳۱

۱۲۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۰

۱۳۔ صغیر اِفراہیم، نثری داستانوں کا ارتقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص ۹۳

۱۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۶۔ Narayani Gupta:"Dehli (Between two Empires 1803-1931", Second edition: Oxford University Press, 1999, Pg3

۱۷۔ Narayani Gupta:"Dehli (Between two Empires 1803-1931", Second edition: Oxford University Press, 1999, Pg4

۱۸۔ Narayani Gupta:"Dehli (Between two Empires 1803-1931", Second edition: Oxford University Press, 1999, Pg5

۱۹۔ Narayani Gupta:"Dehli (Between two Empires 1803-1931", Second edition: Oxford University Press, 1999, Pg13

۲۰۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۱۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲۔۲۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۵۔۲۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۲۔ Pennycook, Alastair,(1998) English and the Discourses of Colonialism. London and New York : Routledge, P,86.

۳۳۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۲۹۔۳۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۶۱

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۷۲۔۵۷۳